مباحثہ ومکالمہ

ڈاکٹر عرفان شہزاد*

قرآن مجید میں خدا کے وعدوں کو خدا کا حکم سمجھنے کی غلطی

اسلام کے سیاسی غلبے کو دینی فریضہ قرار دینے کے حق میں یہ استدلال ایک بنیادی استدلال کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام سے فتح ونصرت کے وعدے کیے تھے جو ان کے حق میں پورے ہوئے۔ یہی وعدے دیگر اہل ایمان کے لیے بھی عام ہیں۔ مسلمان اگر پورے جذبہ ایمانی سے اسلامی حکومت کے قیام کے لیے کوشش کریں گے تو یہ وعدے ان کے حق میں بھی اسی طرح پورے ہوں گے جیسے یہ صحابہ کے لیے پورے ہوئے تھے۔ اس استدلال کے بھروسے پر مسلم تاریخ میں بے شمار مسلح اور غیر مسلح سیاسی تحاریک برپا کی گئیں جن کا انجام تاریخ کے صفحات میں رقم ہے۔ زیر نظر مضمون میں اس استدلال کا تجزیہ زبان وبیان کے معروف اسالیب کی روشنی میں، تاریخی اور معروضی حقائق کے حوالے کیا گیا ہے۔

یہاں دو نکات قابل غور ہیں:

پہلا یہ کہ زبان کا معلوم ومعروف اسلوب ہے کہ وعدہ، حکم نہیں ہوتا، یعنی جب کسی سے کوئی وعدہ کیا جاتا ہے تو یہ نہیں سمجھا جاتا کہ کوئی حکم دیا جا رہا ہے۔ مثلاً میں اپنے بیٹے سے کہوں کہ امتحانات میں اچھی کارکردگی دکھانے پر اسے کوئی انعام دوں گا تو اس کا مطلب بس یہی ہے کہ اس کی کارکردگی اچھی ہوئی تو میں اپنا وعدہ پورا کروں گا۔ اس سے یہ کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا کہ اس انعام کا حصول میرے بیٹے کے لیے فرض ہو گیا ہے یا میرے لیے اپنا وعدہ ہر حال میں پورا کرنا فرض ہو گیا ہے۔ یہ ایک عام فہم بات ہے۔ کوئی صحیح الفہم شخص اس کا انکار نہیں کر سکتا۔

دوسرا یہ ہے کہ وعدہ اگر خاص کسی شخص یا اشخاص سے کیا جائے تو وہی اس کا مخاطب اور مصداق ہوتے ہیں، دیگر لوگ اس سے مراد نہیں ہوتے۔ جیسے مذکورہ بالا مثال میں میرے وعدے کا مخاطب میرا بیٹا ہے۔ اس وعدے کا مصداق بھی وہی ہے، کوئی دوسرا نہیں ہے، حتی کہ اس کے علاوہ میری دوسری اولاد بھی اس وعدے کا مصداق نہیں بن سکتی تاوقتیکہ ان کو بھی اس میں شامل کرنے کا اعلان میں خود نہ کروں، یا وعدے کی نوعیت ہی عام ہو جیسے میں اپنے بچوں سے کہوں کہ جو بھی اچھی کارکردگی دکھائے گا، اسے انعام ملے گا۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ سب اس میں شامل ہوں گے۔ لیکن وعدہ خاص الفاظ میں ہے تو عام ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ بھی ایک معروف بات ہے۔ اس کا انکار بھی ممکن نہیں۔

ای میل: irfanshehzd76@gmail.com

ان دونوں اصولوں کی روشنی میں قرآن مجید میں صحابہ سے متعلق خدا کے وعدوں کو دیکھتے ہیں۔

پہلی بات یہ کہ خدا نے صحابہ کے ساتھ جو وعدے کیے، وہ صرف وعدے ہیں، حکم نہیں۔ اگر کوئی ان کو حکم سمجھتا ہے تو اس کے لیے دلیل درکار ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ خدا کے یہ وعدے صحابہ کے حق میں بعینہ پورے ہوئے کیونکہ وہی ان کے مخاطب تھے، لیکن یہ وعدے دیگر مسلمانوں کے لیے تھے نہ ان کے حق میں پورے ہوئے، کیونکہ وہ ان کے مخاطب ہی نہیں تھے۔ ان خاص وعدوں کو اگر کوئی عام سمجھتا ہے تو اس کے لیے بھی دلیل لانی پڑے گی۔

یہاں قرآن مجید سے خدا کے دو وعدے پیش کیے جاتے ہیں۔ ہم ان کا تجزیہ کر کے دیکھتے ہیں کہ کیا ان وعدوں کو حکم اور پھر اس حکم کو عام سمجھا جانا درست ہو سکتا ہے۔

خدا نے صحابہ سے بحیثیت جماعت وعدہ کیا کہ ان کے صالحین کو اس دنیا ہی میں غلبہ وحکومت عطا کرے گا:

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (139:3)

''اور (جو نقصان تمھیں پہنچا ہے، اُس سے) بے حوصلہ نہ ہو اور غم نہ کرو، اگر تم مومن ہو تو غلبہ بالآخر تمھیں ہی حاصل ہوگا۔''

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِیْ ارْتَضَى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْناً يَعْبُدُونَنِيْ لَا يُشْرِكُونَ بِيْ شَيْئاً وَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُون (55:24)

''تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے عمل کیے ہیں، ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو وہ اِس سرزمین میں ضرور اسی طرح اقتدار عطا فرمائے گا، جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو اس نے عطا فرمایا تھا اور ان کے لیے ان کے دین کو پوری طرح قائم کر دے گا جسے اس نے ان کے لیے پسند فرمایا ہے اور ان کے اِس خوف کی حالت کے بعد اِسے ضرور امن سے بدل دے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے، کسی چیز کو میرا شریک نہ ٹھیرائیں گے۔ اور جو اِس کے بعد بھی منکر ہوں تو وہی نافرمان ہیں۔''

خدا کا ایک وعدہ ہجرت کرنے والے مسلمانوں سے تھا کہ اگر وہ خدا کی راہ میں ہجرت کریں گے تو خدا کی طرف سے بحیثیت جماعت اس دنیا ہی میں امن وخوش حالی پائیں گے۔ یہ وعدہ پہلے وعدے ہی کا ابتدائیہ ہے، تاہم یہ الگ سے بھی کیا گیا ہے، اس لیے بوجوہ اسے یہاں الگ وعدہ شمار کیا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوا فِي اللّٰهِ مِن بَعْدِ مَا ظُلِمُوا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَلَأَجْرُ الآخِرَةِ أَكْبَرُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ (41:16)

''جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی ہے، اِس کے بعد کہ ان پر ظلم ڈھائے گئے، ہم ان کو دنیا میں بھی لازماً اچھا ٹھکانا دیں گے اور آخرت کا اجر تو کہیں بڑھ کر ہے۔ اے کاش، یہ منکرین جانتے۔''

وَمَن يُهَاجِرْ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرَاغَماً كَثِيْراً وَسَعَةً (100:4)

’’(یہ لوگ گھروں سے نکلیں اور مطمئن رہیں کہ) جو اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا، وہ زمین میں پناہ کے لیے بڑے ٹھکانے اور بڑی گنجایش پائے گا۔‘‘

ہم جانتے ہیں کہ صحابہ سے کیے گئے یہ دونوں وعدے صحابہ کے حق میں پورے ہوئے۔ انھوں نے ہجرت کے نتیجے میں امن وخوش حالی بھی پائی اور اپنے مخالفین کے ساتھ ہونے والی جنگوں کے نتیجے میں غلبہ وحکومت بھی۔

زبان وعقل کے عام اور معروف فہم کے مطابق، خدا کے یہ وعدے حکم نہیں ہو سکتے، دوسرے یہ کہ یہ وعدے عام نہیں ہو سکتے، لیکن مسلمانوں نے دونوں مغالطے اختیار کیے: انھوں نے ان وعدوں کو حکم بھی سمجھا اور اس مزعومہ حکم کو عام بھی سمجھا۔ اس کے نتیجے میں انھوں نے حصول غلبہ وحکومت کو اپنے لیے دینی فریضہ اور اس کے وقوع کو خدائی وعدہ قرار دے دیا۔ پھر اس بھروسے پر انھوں نے تاریخ کے مختلف ادوار میں حصول اقتدار کے لیے مسلح اور غیر مسلح سیاسی تحریکیں برپا کیں جو کم وبیش تمام کی تمام ناکامی سے دوچار ہوئیں۔ اس قسم کی تحریکوں اور ان کی ناکامیوں کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ قرآن مجید میں بڑی وضاحت سے یہ بیان آیا ہے کہ خدا اپنے اصول کبھی نہیں بدلتا۔ اگر یہ وعدے عام مسلمانوں کے لیے بھی ہوتے تو کامیابی ان کو بھی نصیب ہوتی۔ چونکہ یہ وعدے عام مسلمانوں کے لیے تھے ہی نہیں، اس لیے ان کے لیے پورے بھی نہیں ہوئے۔ خدا نے اپنا اصول نہیں بدلا۔

بالکل اسی طرح، جب کبھی مسلمانوں کی کسی جماعت کو کسی علاقے سے ہجرت کرنا پڑ جاتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ساری زندگی مہاجر کیمپوں میں کسمپرسی کے عالم میں گزار دیتے ہیں، مگر بحیثیت جماعت امن وخوش حالی کا منہ نہیں دیکھ پاتے۔ یہاں افراد کی انفرادی حیثیت نہیں، بلکہ جماعتی حیثیت مدنظر ہے۔ چنانچہ جس ملک میں بھی یہ جا کر رہ پاتے ہیں، دوسرے بلکہ تیسرے درجے کے شہری کی حیثیت سے ہی رہ پاتے ہیں۔ ہجرت کے بعد امن وخوش حالی کے خدائی وعدے بھی اگر عام ہوتے تو ان کے حق میں بھی پورے ہوتے نظر آتے۔ چنانچہ تاریخی اور معروضی حقائق بھی اس فہم کے خلاف کھڑے ہیں کہ صحابہ سے کیے جانے والے لازمی فتح ونصرت اور لازمی امن وخوش حالی کے وعدے عام ہیں۔

یہاں تاویل کرنے والے یہ کہہ سکتے ہیں کہ غلبہ وحکومت کے وعدے اعلیٰ ایمان کے ساتھ مشروط ہیں۔ چونکہ صحابہ جیسا ایمان اب تک دستیاب نہ ہو سکا، اس لیے یہ وعدے عام مسلمانوں کے حق میں کبھی پورے ہو کر نہ دیے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ بات ماضی وحال میں برپا ہونے والی تمام مسلح وغیر مسلح سیاسی تحاریک کے لیے علی الاطلاق کہی جا سکتی ہے، حالانکہ ان میں سے بعض بلکہ اکثر کے تذکرے ان کے رہنماؤں اور ان میں شامل افراد کے اعلیٰ کردار اور ایمان افروز واقعات سے بھرے پڑے ہیں؟ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اپنے جان ومال قربان کر دینے سے بڑھ کر ایمان ونیت کے خالص پن کا اور کیا ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے اور مسلم عسکری تنظیمیں یہ قربانیاں آج بھی پیش کر رہی ہیں؟ تاہم، حقیقت یہ ہے کہ غلبہ وحکومت انھیں میسر نہ آئے۔

بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ ان تمام لوگوں میں سے کوئی بھی پورے ایمان والے نہ ہو سکے تو ہجرت پر مجبور کر دیے جانے والے مسلمانوں کی مظلومیت میں تو عموماً کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔ ہجرت کے بعد امن وخوش حالی کے وعدے اگر عام ہوتے تو بحیثیت جماعت عام مسلم مظلوم مہاجرین کے حق میں تو لازماً پورے ہونے چاہیے تھے، مگر وہ

بھی نہیں ہوتے؟ اور اگر ہجرت کے بعد کے وعدے عام نہیں ہیں، تو غلبہ وحکومت والے وعدے کیونکر عام ہو سکتے ہیں؟

ان سوالوں کا جواب اس کے سوا اور کیا ہے کہ غلبہ وحکومت اور امن وخوش حالی کے یہ وعدے عام نہیں تھے۔ عام مسلمان ان وعدوں کا مخاطب ہیں نہ مصداق۔

بعض حضرات خدا کے ان وعدوں میں موجود غلبہ وحکومت کی بشارتوں کو اخلاقی فتح قرار دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ خدا کے ان وعدوں کی رو سے صحابہ کو کیا صرف اخلاقی فتح ملی تھی؟ ان سے وعدہ دنیوی سیاسی غلبے وحکومت کا تھا، انھیں وہی ملا۔ اب دیگر لوگوں کے لیے یہ وعدہ اگر صرف اخلاقی فتح تک محدود ہو گیا ہے تو اس تخصیص کی کیا دلیل ہے؟ اور اگر یہ تخصیص مان بھی لی جائے تو پھر مسلمانوں کو مسلح وغیر مسلح سیاسی تحاریک برپا کرنے کی بجائے اخلاق کے میدان میں ہی فتح حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے؛ یا پھر یہ مان لیا جائے کہ اس اخلاقی فتح کا یہ فہم غلبہ وحکومت کے حصول میں کوشاں گزشتہ اور موجودہ تحاریک کے سربراہان کو بھی نہ تھا اور نہ ہے۔ وہ اسے سیاسی فتح ہی سمجھتے رہے، مگر ناکامی کے بعد قرآن کے وعدوں کا عمومی مصداق اور ان تحریکوں کی شکست دونوں کا محل درست کرنے کے لیے اسے اخلاقی فتح قرار دینے کی کوشش کی گئی۔

یہاں اس سوال کو بھی لے لینا چاہیے کہ صحابہ ہی کے ساتھ یہ وعدے کیوں کیے گئے اور انھی کے حق میں کیوں پورے ہوئے؟ یہ وعدے عام نہیں تھے تو قرآن میں قیامت تک کے مسلمانوں کے لیے ان کے تذکرے کا مقصد کیا ہے؟

اختصار سے بیان کیا جائے تو اس سب کا مقصد مسلمانوں کو وہ سرگزشت سنانا ہے جس میں خدائی مدد سے جزیرہ عرب میں ایک غیر معمولی واقعہ برپا کیا گیا تا کہ وہ ایک نشانِ حق بن کر قیامت تک کے انسانوں کے لیے تذکیر اور دعوت ایمان کا سامان بن جائے۔ بالکل اسی طرح جس طرح دیگر رسولوں کی سرگزشت ہم قرآن مجید میں پڑھتے ہیں جن میں ہم خدا کی خاص نصرت کے واقعات عبرت اور تذکیر کے لیے پڑھتے ہیں، جیسے موسیٰ علیہ السلام کا قصہ جس میں موسیٰ علیہ السلام خدا کی خاص مدد سے اپنے دشمنوں پر اپنے عصا، عبور بحر اور دیگر معجزات کے ذریعے غالب آئے۔ ان کو پڑھتے وقت ہم یہ نہیں سمجھتے کہ موسیٰ علیہ السلام کی طرح ہم بھی کسی فرعون سے جا ٹکرائیں تو خدا کی مدد اسی طرح نازل ہو گی جس طرح موسیٰ کے لیے اتری تھی۔ ہم اسے خدا کا ایک خاص نشانِ حق سمجھ کر پڑھتے ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ خدا کے رسولوں کا اسی دنیا میں اپنے مخالفین پر غالب آ جانا خدا کا ایک خاص قانون ہے:

كَتَبَ اللّٰهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِيْ إِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ (21:58)

''اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول غالب ہو کر رہیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ بڑے زور والا اور بڑا زبردست ہے۔''

چنانچہ ہر رسول کے مخالفین خدائی عذاب کے نتیجے میں بالآخر مغلوب ہوئے۔

قرآن مجید کی درج ذیل آیت بھی اسی تناظر میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلبے کا خدائی فیصلہ سناتی ہے:

هُوَ الَّذِيْ أَرْسَلَ رَسُوْلَهُ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (33:9)

''وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ (اِس سرزمین کے) تمام ادیان پر اس کو غالب کردے، خواہ مشرکین اِسے کتنا ہی ناپسند کریں۔''

یہ غلبہ خدا کے مذکورہ قانون کے مطابق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی ظاہر ہو کر رہا۔ اس سے دیگر مسلمانوں کے لیے سیاسی غلبے کے حصول کی ہدایت یا حکم کا کوئی قرینہ نہیں نکلتا۔ آیت میں موجود الدین کلہ (تمام ادیان) کے الفاظ سے غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ ''تمام ادیان'' وہ ادیان تھے جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوتے ہوئے غالب آنا تھا، یعنی جزیرہ عرب میں پائے جانے والے ادیان۔ یہ تخصیص اس لیے کہ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے دین کا غالب ہونا بیان کیا جا رہا ہے۔ مزید یہ کہ آیت میں موجود المشرکین کا الف لام عہد کا ہے جو تمام مشرکین نہیں بلکہ عرب کے مشرکین کو بیان کر رہا ہے۔ اس غلبے کے خاص ہونے کا یہ ایک مزید واضح قرینہ ہے۔

دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ذریت ابراہیم کو ان کے ایمان وعمل کے مطلوبہ معیار پر پورا اترنے کی صورت میں اسی دنیا میں غلبے کا وعدہ اور ایمان وعمل میں غیر مطلوب طرز عمل اختیار کرنے پر اسی دنیا میں ذلت ورسوائی کی وعید سنائی ہے:

چنانچہ پہلے مرحلے میں ذریت ابراہیم کی ایک شاخ، بنی اسرائیل اس امتحان کے لیے چنے گئے تھے:

يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَوْفُوا بِعَهْدِي أُوفِ بِعَهْدِكُمْ وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ (سورۃ البقرہ، 40:2)

''اے بنی اسرائیل، میری اُس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر کی تھی اور میرے عہد کو پورا کرو، میں تمھارے عہد کو پورا کروں گا، اور مجھ ہی سے ڈرتے رہو۔''

یہ وعدہ یہی تھا کہ خدا کے فضل وسرفرازی کی جو نعمت وہ اپنی حرکتوں کی وجہ سے گنوا چکے ہیں، انھیں دوبارہ مل سکتی ہے اگر وہ اپنی روش بدل کر دوبارہ خدا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اختیار کر لیتے ہیں۔

دوسرے مرحلے میں ذریت ابراہیم کی دوسری شاخ، بنی اسماعیل چنے گئے:

أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَى مَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِن فَضْلِهِ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُم مُّلْكاً عَظِيماً (54:4)

''کیا یہ لوگوں سے اللہ کی اس عنایت پر حسد کر رہے ہیں جو اس نے ان پر کی ہے؟ (یہی بات ہے تو سن لیں کہ) ہم نے تو اولاد ابراہیم (کی اِس شاخ یعنی بنی اسماعیل) کو اپنی شریعت اور اپنی حکمت بخش دی اور انھیں ایک عظیم بادشاہی عطا فرما دی ہے۔''

پھر انہی مسلمانوں سے گزشتہ سنت الٰہی کے مطابق وعدہ کیا گیا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوَا إِن تُطِيعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا يَرُدُّوكُمْ عَلَى أَعْقَابِكُمْ فَتَنقَلِبُوا خَاسِرِينَ (آل عمران، 149:3)

''ایمان والو، اگر اِن منکروں کی بات مانو گے تو یہ تمھیں الٹا پھیر کر رہیں گے اور تم نامراد ہو جاؤ گے۔''

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (139:3)

''اور (جونقصان تمھیں پہنچا،اس سے) بے حوصلہ نہ ہواور غم نہ کرو، اگر تم مومن ہوتو غلبہ بالآخر تمھیں ہی حاصل ہوگا۔''

ان کی ہجرت کے بعد امن وخوش حالی بھی اسی وعدے کی فرع تھی۔

اس خصوصی اہتمام کی وجہ دین کے لیے انسانی محافظین کا چناؤ، ان کے ذریعے سے بعد از رسالت دنیا میں تبلیغ دین اور عام لوگوں کے لیے خدا کی زندہ نشانی قائم کرنا تھا کہ کس طرح ذریت ابراہیم اپنے ایمان وعمل کی درستی اور بگاڑ کی بنیاد پر بار بار عروج وزوال کے ادوار سے گزرتے ہیں۔ چنانچہ بنی اسرائیل کی ساڑھے تین ہزار سالہ تاریخ اور بنی اسماعیل کی ڈیڑھ ہزار سالہ تاریخ میں خدا کے اس فیصلے کی داستانیں دیکھی جا سکتی ہیں۔

یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ صحابہ نے دشمنان اسلام کے خلاف جو قتال کیا، وہ غلبہ وحکومت کے لیے نہیں، بلکہ خدا کے نافرمانوں کو اتمام حجت کے بعد خدا کے حکم سے آخری سزا دینے کے لیے اور مظلوم مسلمانوں کو ان کے پنجہ ظلم سے چھڑانے کے لیے کیا تھا:

قَـاتِـلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ (سورہ التوبہ 14:9)

''ان سے لڑو، اللہ تمھارے ہاتھوں سے ان کو سزا دے گا اور انھیں ذلیل وخوار کرے گا اور تمھیں ان پر غلبہ عطا فرمائے گا اور مومنوں کے ایک گروہ کے کلیجے (اس سے) ٹھنڈے کرے گا۔''

وَمَـا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَـقُـولُـونَ رَبَّـنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَـذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ وَلِيّاً وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ نَصِيراً (75:4)

''(ایمان والو)، تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے نہیں لڑتے جو فریاد کر رہے ہیں کہ پروردگار، ہمیں ظالموں کی اس بستی سے نکال اور ہمارے لیے اپنے پاس سے ہمدرد پیدا کر دے اور اپنے پاس سے حامی اور مددگار پیدا کر دے۔''

مسلمانوں کے غلبہ وحکومت کا ذکر ان مہمات کے نتیجے اور خدا کی طرف سے انعام کے طور پر کیا گیا ہے۔ ذریت ابراہیم کے علاوہ، خدا نے اپنے ذمے یہ لیا ہے نہ اس پر لازم ہے کہ مسلمانوں کے دیگر گروہوں کے لیے بھی یہی قانون لاگو کرے۔ ان وعدوں کو حکم اور پھر حکم کو اپنے لیے عام سمجھنا مسلمانوں کی اپنی غلط فہمی ہے۔ خدا ان کی غلط فہمی کا ذمہ دار نہیں، اور نہ وہ ان کی غلط فہمی کی وجہ سے اپنے اصول بدلنے والا ہے۔

اپنے حقوق کے لیے اگر سیاسی جدوجہد کرنا مسلمانوں کے حالات کا تقاضا ہو تو وہ اسے انسانی سماج کی ایک ضرورت سمجھ کر اختیار کر سکتے ہیں، نہ کہ کوئی دینی فریضہ سمجھ کر۔ نیز یہ بھی ذہن میں رہے کہ ان کی کاوشوں کی وجہ سے خدا پر ان کی فتح ونصرت کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ خدا کی حکمت کا تقاضا ہوگا تو وہ مدد کر بھی سکتا ہے، مگر یہ نہ اس کا وعدہ ہے نہ کوئی عام قانون۔

سماجی حقیقت یہ ہے کہ آج کے کثیر القومی اور کثیر المذاہب جمہوری سماجوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی، وہاں ان کو اپنی حکومت تشکیل دینے میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آنی چاہیے جہاں وہ اسلام کے مسلم اجتماعیت سے متعلق احکامات مسلم کمیونٹی پر لاگو کریں۔ اور جہاں وہ اقلیت میں ہوں، وہاں انھیں ایک مفید، صالح اور دوستانہ اقلیت بننے سے کوئی چیز مانع نہیں ہونی چاہیے۔ تاہم، ان کے صالح طرز عمل کے باوجود بطور اقلیت انھیں اپنے سماج کے نظام یا سماجی رویوں کی وجہ سے کسی ناانصافی یا زیادتی سے پالا پڑتا ہے تو اس کی اصلاح کی ہر ممکن کوشش، جس کی اجازت سماج اور قانون انھیں دیتا ہے، انھیں کرنی چاہیے۔ ناانصافی اور زیادتی کی ایسی صورت حال تو مسلم اکثریت کے سماج میں مسلمانوں کے مختلف مسلکی یا لسانی گروہوں کو بھی درپیش رہتی ہے۔ جاننا چاہیے کہ یہ مذہبی سے زیادہ انسانی رویوں کا مسئلہ ہے۔ اس کا حل ہتھیار اٹھا لینا نہیں، سماجی رویوں کی اصلاح کی کوششیں کرنا ہے۔ تاہم، معاملہ اگر مسلم کمیونٹی کی برداشت سے باہر ہو جائے تو انھیں وہاں سے ہجرت کر جانی چاہیے۔ ہجرت بھی ممکن نہ ہو تو بیرونی ریاستی طاقتوں اور اداروں کو مدد کے لیے بلایا جانا چاہیے، نہ کہ خود ہتھیار اٹھا کر اپنے لیے مزید خرابی کے اسباب پیدا کرنا چاہئیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں دیکھا جا سکتا ہے کہ عہد رسالت میں مسلمانوں میں سے جو لوگ ہجرت نہ کر پائے تھے اور کفار کے ظلم کا شکار تھے تو مدینہ کی اسلامی ریاست کو ان کی مدد کے لیے ابھارا گیا لیکن جہاد کے احکام نازل ہو جانے کے باوجود ان محکوم و مظلوم مسلمانوں کو ہتھیار اٹھا لینے کا کوئی حکم نہیں دیا گیا بلکہ یہ ہدایت دی گئی کہ خدا سے دعا کریں کہ وہ کسی طاقت کو ان کی مدد کے لیے بھیجے۔ (دیکھیے مذکورہ بالا آیت 75:4) نوبت البتہ اگر یہاں تک پہنچ جائے کہ مسلمانوں کی طرف سے پرامن رہتے ہوئے بھی ان کے مخالفین کی طرف سے ان کی جان، عزت اور آبرو بھی محفوظ نہ رہیں تو ذاتی دفاع کے فطری حق کے لیے لڑ پڑنا، ہتھیار اٹھا لینا ناگزیر تقاضا بن جاتا ہے۔

دور جدید میں دنیا کے کثیر القومی اور کثیر المذاہب سماجوں میں مسلمانوں کو درپیش مسائل کے پیچھے بڑی وجہ مسلمانوں کی اپنے دین کی بنیاد پر دیگر کمیونٹیز پر غالب آنے کی نفسیات ہے۔ مسلمان اگر اس نفسیات سے باہر آ جائیں تو بقائے باہمی کے اصول پر دنیا کے ساتھ آگے بڑھ سکتے ہیں۔ دنیا بھی ان پر بھروسہ کرے گی اور جن مشکلات کا سامنا انھیں اب ہے، ان میں سے اکثر کا خاتمہ ہو جائے گا۔ المیہ مگر یہ ہے کہ مسلمانوں نے دین کے نام پر غلبے کے حصول کے لیے جن مشکلات کا راستہ اپنے لیے چنا ہے، وہ ان کے دین کا تقاضا ہی نہیں ہے۔ جن وعدوں کے بھروسے پر یہ سب کیا جا رہا ہے، وہ وعدے ان کے لیے ہیں ہی نہیں۔

دین کا اصل مقصد تزکیہ نفس ہے۔ مسلمانوں سے ان کے دین کا تقاضا یہ ہے کہ ایک مسلمان جہاں بھی رہے، اپنی انفرادی اور سماجی حیثیت کے مطابق ایمان و عمل کے بہترین معیار کے حصول میں کوشاں رہے۔ پھر وہ چاہے باپ ہو یا بیٹا، معلم ہو یا شاگرد، حاکم ہو یا محکوم ہر حال میں خدا کے حکم کا پابند ہو کر رہے۔ مسلمان جتنا جلد ان حقائق کو باور کر لیں، اتنا ہی ان کے لیے بہتر ہے تاکہ ان کی توانائیاں غیر ضروری ترک تازیوں میں ضائع ہونے کی بجائے مثبت مقاصد کے لیے استعمال ہو سکیں۔